ابن خلدون سوسائٹی اور لندن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس

(6-8 ستمبر 1996ء)

1990ء میں مغربی طاقتیں اپنی ان تھک کوششوں اور انتہائی منظم پروپگنڈے سے اپنے حریف سویت یونین کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئیں اور عالمی سٹیج پر مغرب کی سیاسی "انا" کو چیلنج کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ لیکن مغرب نے ستانے اور دم لینے کی بجائے اپنی توپوں کا رخ مسلم دنیا کی طرف پھیر دیا' کیوں کہ انہیں ڈر ہے کہ مسلم دنیا کے قلب و جگر اور لاشعور میں اپنے اجتماعی نظام اور مغرب کی سیاسی سازشوں کے خلاف بغاوت کی آگ برابر سلگ رہی ہے۔ چنانچہ عرب اور مسلم دنیا کی قدرتی دولت پر قبضہ کو دوام بخشنے کے لیے بنیاد پرستی کا سہارا لیا گیا اور کہا گیا کہ بنیاد پرستی' خواہ اس کا کوئی بھی نام ہو' موجودہ تہذیب اور جمہوریت کے لیے خطرہ ہے۔ (1)

1- امریکہ کے آنجہانی صدر نکسن کی کتاب "Seize The Moment" کی آخری فصل "مسلم دنیا" پر ہے' جہاں انہوں نے مسلم "بنیاد پرستی" کو مغرب کے لیے ڈراؤنا خواب قرار دیا ہے۔ وہاں انہوں نے مسلمانوں کے دور عروج کو تہذیب و تمدن کے لیے ترقی کا دور شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ مغرب اور مسلم دنیا باہمی تعاون سے امن و آشتی کی دعوت کو آگے بڑھا سکتے ہیں' نیٹو کے ایک سابق بلجیکی سیکرٹری نے بھی CNN کے ایک انٹرویو میں "مسلم بنیاد پرستی" کو تہذیب کے لیے خطرہ قرار دیا تھا۔

اس صدی کے آغاز میں مغرب نے اپنی جارحانہ پالیسی کے جواز میں "پین اسلام ازم" کا سہارا لیا اور اسے تہذیب کے لیے خطرہ قرار دیا' حالانکہ "پین اسلام ازم" کی مہمل ترکیب خود انہی طاقتوں نے تراشی تھی' جو مسلم دنیا پر سیاسی قبضہ کرنے کے لیے نئے نئے منصوبے بنا رہی تھیں۔ (2)

آج مغرب اسلام کی سیاسی تعبیر کو جس کا دوسرا نام سوسائٹی میں انسانی وقار کا تحفظ ہے' بنیاد پرستی سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مغرب کے اہل سیاست کے ساتھ ساتھ بعض دانشور اور سکالرز بھی شریک ہوگئے ہیں۔ اگر یہ پروپیگنڈا خالص سیاسی سطح پر ہوتا' تو شاید چنداں تعجب نہ ہوتا' کیوں کہ "سیاست" سے اس کے علاوہ اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے' لیکن مسلم دنیا کے خلاف یہ پروپیگنڈا "مذہب" کے نام سے کیا جا رہا ہے۔ جس سے مسلمانوں کی ایک جماعت نے اپنی سادگی سے یہ تاثر لیا ہے کہ مغرب مسلمانوں کی "طاقت" سے واقعی خوف زدہ ہے۔ چنانچہ اس تاثر سے (جسے مغربی حلقے انتہائی دقت نظر سے ہوا دے رہے ہیں) جہاں مسلم دنیا کے بعض حلقوں میں انتہا پسندی کے رجحانات کو تقویت ملی ہے اور سادہ لوح نوجوانوں نے اپنے سیاسی اور اجتماعی مسائل کا حل انتہا پسندی کو قرار دیا ہے' وہاں یہ تاثر مغرب کو اس کی جارحانہ پالیسی کے لیے وجہ جواز بھی فراہم کرتا ہے۔

یہ انتہا پسندی ہماری فکری' سیاسی اور فوجی شکست اور احساس محرومی کا نتیجہ ہے' جس کا کھل کر اعتراف کرنا ہم اپنی "انا" کے خلاف جانتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان' تاریخ کے تاریک ترین دور میں بھی انتہا پسندی کی راہ پر کبھی نہیں چلے۔ مسلمانوں کے بارے میں قرآن مجید نے "امت وسط اور خیر امتہ" کے الفاظ بولے ہیں یعنی یہ جماعت جس کا بنیادی وظیفہ حیات نیکی کی تلقین اور

(2) (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : جمال الدین افغانی اور عرب رہنما۔ فکر و نظر' اسلام آباد' اگست 1977ء)

بدی سے اجتناب ہے' اعتدال' توازن اور میانہ روی کی راہ پر چلتی رہی ہے' اور جب کبھی کسی گروہ نے اس راہ کو چھوڑا' تو اسے مجموعی طور پر مسترد کر دیا گیا۔ تاریخ اسلام کے آغاز میں خوارج نے انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیدنا حضرت علیؓ جیسے خلیفہ راشد کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور ایک وقت تک ہنگامے کرتے اور مسلمانوں کا خون بہاتے رہے' لیکن بالاخر مسلمانوں کے اجتماعی ارادے نے انہیں مسلم سٹیج سے پیچھے دھکیل دیا۔ موجودہ وقت میں اگر کسی پارٹی نے مذہبی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دین کی تعبیر ریاست سے کی' اور اپنے سیاسی مقاصد کے لیے تشدد کی راہ اختیار کی' تو علمائے حق' جادۂ اعتدال پر چلنے والے اہل فکر اور عوام نے اسے مسترد کر دیا۔ حتی کہ ہم غیر ملکی سامراج کے خلاف چلنے والی تحریک آزادی میں بھی ایک توازن' اعتدال اور ضبط نفس دیکھتے ہیں' جمال الدین افغانی' عبدہ' عبدالرحمان کواکبی' سرسید' شبلی' اقبال' ابوالکلام اور محمد علی جناح نے ہمیشہ اعتدال' ضبط نفس' استقامت' میانہ روی اور تشدد سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور اگر کبھی اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھانا پڑا' تو پھر بھی فوجی قائدین نفرت اور تشدد سے مقدور بھر دور رہے' پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے مصطفیٰ کمال کی فوجی قیادت میں ترکی کے تاریخی مقامات پر قبضہ کرنے کے لیے اتحادیوں کے نمائندے یونان کو ذلت آمیز شکست پر شکست دی۔ لیکن ترک رہنماؤں نے تشدد' نفرت اور اس قسم کے دوسرے حربوں کو اختیار کرنے سے یک قلم گریز کیا' ایسے ہی 1956ء میں جمال عبدالناصر نے نہر سویز پر قبضہ کیا تو لندن اور پیرس کی سرکاری پالیسی ناصر کے خلاف آگ اگلتی رہی' حتی کہ اینگلو فرنچ فوجوں نے مصر پر حملہ بھی کر دیا۔ لیکن مصری حکمرانوں نے مغرب کے خلاف نہ تو نفرت و تشدد کا نعرہ بلند کیا اور نہ ہی غیر ملکی افراد کو قتل کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مشرق میں نہ صرف امت مسلمہ نے اپنے سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے تشدد اور نفرت کا سہارا نہیں لیا' بلکہ

دوسری قوموں نے بھی اپنی آزادی کے لیے تشدد اور نفرت کی سیاست کو مسترد کر دیا اور اگر کہیں مسلم دنیا میں تشدد کو اپنایا گیا تو اس کا پہلا نشانہ خود مسلمان ہی بنے۔ القصہ آج مسلم دنیا میں اگر کہیں مغرب کے سیاسی طرز عمل کے خلاف مذہب کے نام پر نفرت یا تشدد کا اظہار کیا جا رہا ہے' تو اس کی ایک وجہ مغرب کا مسلسل جارحانہ طرز عمل ہے' جس کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان بہ وجوہ سکت نہیں رکھتے۔ مثلاً آج فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کے ہاتھوں جس بے دردی سے انسانی ناموس و وقار کو پامال کیا جا رہا ہے' اس پر مغربی طاقتوں کی خامشی یا عربوں کی حمایت میں کوئی "پرامن بیان" یا کسی فرانسیسی صدر یا برطانوی وزیر خارجہ کا غزہ یا بیت المقدس میں پرامن ورود' یہ بے ضرر اور ہلکی پھلکی باتیں' برطانیہ' فرانس اور امریکہ' اپنے احساس جرم کی تسکین کے لیے کر رہے ہیں۔ اب اگر کسی عرب یا مسلمان ملک میں کوئی غیر ملکی سیاح تشدد کا نشانہ بنتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی احساس محرومی ہے' جس نے بعض مسلم نوجوانوں کے دل و دماغ کو آگ سے بھر دیا ہے اور وہ زندگی اور مذہب کے حقائق کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں اور انتہائی پسندی کی راہ پر چلتے ہوئے نہ صرف جدید صحت مند فکری' سیاسی اور معاشی افکار کا انکار کرتے ہیں' بلکہ بے گناہ شہریوں یا غیر ملکی باشندوں کو قتل کرنے کا گناہ بھی اپنے سر لے لیتے ہیں۔

مسلم دنیا میں اہل دانش کی یہ تمنا رہی ہے کہ معاشرے کا نوجوان گروہ زندگی کی بلند قدروں اور مذہب کی پاکیزہ روایات سے سرشار ہو کر معاشرے میں ایک صحت مند کردار ادا کرے اور اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنی فکری اور اخلاقی روایات کی روشنی میں حل کر کے مظلوم عوام کو استحصالی سیاست اور جاگیردارانہ کلچر سے نجات دلائے۔

بے شبہ اس تمنا کا انفرادی طور پر برابر اظہار ہوتا رہا ہے۔ اس

موضوع پر ایک مدت سے مقالے لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں' لیکن کسی سیاسی جماعت نے فکری اور علمی سطح پر اس مسئلے کو سلجھانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی' بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ آج پاکستان میں کوئی بڑی سیاسی جماعت خواہ وہ اقتدار میں ہو یا اپوزیشن میں' اپنے ہاں ریسرچ یا تحقیق کا کوئی شعبہ یا اپنے نوجوانوں کی فکری و اخلاقی تربیت کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام نہیں رکھتی۔ البتہ الیکشن جیتنے کے لیے سیاسی یا اقتصادی اصلاحات کے نام سے ایک منشور ضرور شائع کرتی ہے۔ رہا غریب عوام کی معاشی ترقی کا مسئلہ یا پروقار زندگی بسر کرنے کا سوال تو یہ سب باتیں آتشیں تقریروں' نعروں اور کھوکھلے وعدوں کی نذر ہو جاتی ہیں' جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ آج پوری مسلم دنیا عمومی طور پر سیاست' معیشت' علم اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے کہیں پیچھے ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال کا معروضی جائزہ لینے کے لیے امریکہ میں ابن خلدون سوسائٹی نے جنم لیا ہے۔

ابن خلدون سوسائٹی کے مقاصد

بے شبہ آج پوری دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت ناک ترقی کی وجہ سے ایک کنبہ بن گئی ہے' جغرافیائی فاصلے سمٹ گئے ہیں' زبان و نسل کی دیواریں گر رہی ہیں' معاشی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں اور پوری دنیا سمٹ کر ایک "عالمی دیہات" بن کر رہ گئی ہے۔ اس عالمی دیہات میں وہی گروہ صحت مند کردار ادا کر سکتا ہے' جو علم' فلسفہ' اخلاق' سیاست' معیشت اور عہد حاضر کے فکری رجحانات پر گہری نظر رکھتا ہو اور عملی طور پر خدا پرستی اور انسان دوستی کے جذبہ سے سرشار۔ بے شبہ دنیا کے لیے ایک "عالمی دیہات" کا تحفہ سائنس کا معجزہ ہے' لیکن پیغمبر اسلامؐ نے آج سے صدیوں سال پہلے فرمایا تھا: پوری مخلوق خدائی کنبہ ہے' خدا کی نگاہ میں وہی عزیز تر ہے جو اس کے کنبہ

کے لیے سب سے زیادہ سود مند ہے (الخلق عیال اللّٰہ' احبھم ابرھم لعیالہ) چنانچہ مسلم دنیا کا فرض ہے کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر اپنی تلاش کرے' اور اپنے کروڑوں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے موجودہ اجتماعی نظام کی بساط کو الٹ دے اور آفاقی گاؤں کو صحیح معنی میں "خدائی کنبہ" بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور اپنے مسائل پر قابو نہ پایا' تو پھر دنیا بہت جلد بہ قول اقبال "ہم سے اپنی جان چھڑا لے گی۔"

"I amd quite senible of the difficulties that lie in our way, all that I can say is that if we cannot get ver our difficulties, the world will soon get rid of us"

مقام مسرت ہے کہ ابن خلدون نامی سوسائٹی ان تمام مسائل کا جائزہ لے رہی ہے' جو آج مسلم سوسائٹی کو درپیش ہیں مثلاً:

1- اسلام میں عورت اور اقلیتوں کا کیا مقام ہے؟

2- کیا ایک مسلمان سیکولر ہو سکتا ہے؟

3- عالمی دیہات (Global Village) میں اسلامی کلچر کا چراغ کس طاق پر روشن ہو گا؟

4- غیر مسلم معاشروں میں اسلامی ثقافت اپنا کردار کیوں کر ادا کر سکتی ہے۔

آج مسلم نوجوان اپنی سوسائٹی کے استبداد سے خواہ وہ کسی نام سے ہو' آزادی چاہتے ہیں' نیز وہ مغرب کی سیاسی فکر اور روایات کا از سرنو جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنے ان مبہم سیاسی اور ثقافتی افکار کا بھی معروضی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں جو مذہب کے نام سے پیش کئے جا رہے ہیں' جنہیں مغرب اپنے سیاسی مفاد کے لیے ہوا دے رہا ہے۔ ان مسائل پر مسلم دنیا کی تمام جماعتیں'

قدامت پسند ہوں یا ترقی پسند' مغرب نواز ہوں یا روحانی بحث کر رہی ہیں۔ چنانچہ ان تمام مسائل پر بحث کرنے کے لیے ابن خلدون سوسائٹی نے لندن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انتظام کیا۔ جس میں 24 مسلم اور غیر مسلم ملکوں کے دانشوروں اور سکالرز نے حصہ لیا اور الجھے مسائل ہوئے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

یہ اجتماع 6 ستمبر1996ء کو لندن میں سینٹ میری (Mary) یونیورسٹی کالج میں ہوا' ابن خلدون سوسائٹی نے اجتماع میں شریک ہونے والے سکالرز کے قیام و طعام کا انتظام بھی اسی کالج میں کیا تھا۔ کالج کی وسیع و عریض عمارات' کھیلنے کے خوب صورت گراؤنڈز' مطالعے کے لیے لائبریری' عبادت کے لیے کلیسا' غرضیکہ کالج کی خوب صورت عمارتیں اور ان کا نظم و نسق زبان حال سے تعلیم و تربیت سے وابستہ ارباب کالج کی گہری دلچسپی کا پتہ دے رہی ہیں۔

6 ستمبر کے اجتماع میں ڈاکٹر عفت حسن نے اسلام میں عورت کے مقام پر ایک مقالہ پڑھا' جسے خاکسار لاہور میں بھی سن چکا تھا۔ مقالے میں علمی سنجیدگی کی بجائے صحافتی رنگ غالب تھا۔ اسی لیے مرد کی "بالادستی" کے خلاف فاضل مقالہ نگار کا لب و لہجہ تند و تیز تھا۔ سوالات کے وقفے میں بحث میں جن لوگوں نے حصہ لیا' ان میں بھارت کی مندوب مسز سوہنا خان نمایاں تھیں' سوہنا خان وہی خاتون ہیں' جنہوں نے کئی سال قبل بھارتی عدالت میں شاہ بانو کیس کا مقدمہ لڑا تھا۔ سوہنا خان ترقی پسند خاتون ہیں' لیکن وہ مغرب کے حوالے سے نہیں بلکہ اسلام ہی کی راہ پر چل کر عورت کے غصب شدہ حقوق کو بحال کرنا چاہتی ہیں۔ 8 ستمبر کی شام کو ایک اجلاس میں جو رات کے ایک بجے تک جاری رہا' مسز سوہنا خان نے تفصیل سے بھارت میں ہونے والی سماجی تبدیلیوں پر بات چیت کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مسلمان اعتدال و توازن کی راہ پر چل کر ممکنہ خطرات سے بچ سکتے ہیں۔

7 ستمبر کو امت مسلمہ کے اتحاد (Muslim Unity) کا مسئلہ زیر بحث آیا' اس نشست میں پروفیسر احمد محی الدین گرانوف (Ahmad.M.Granoff) نے ایک خوب صورت تقریر کی' جو ان کے سوز دروں کی ترجمان تھی۔ پروفیسر موصوف نے کہا کہ آج دنیا میں تجارتی' فوجی اور دوسرے گروہ ان آدمیوں کی بہ نسبت تیزی سے "عالمی بستی" کی طرف بڑھ رہے ہیں جو آفاقی قدروں کی اشاعت و ترویج کے لیے کام کر رہے ہیں۔ آج یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ پوری دنیا نے آفاقی قدروں کو تسلیم کر لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان آفاقی قدروں کو کیوں کر عملی صورت میں آگے بڑھایا جائے۔ ذرا سوچئے کہ آج کس قدر سرمایہ لوگوں کے باہمی خوف کی نذر ہو جاتا ہے۔ آج تعلیم' صحت اور عوام کی فلاح و بہبود پر جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے' ذرا اس کا مقابلہ اس سرمایہ سے کیجئے جو فوجی ساز و سامان پر خرچ کیا جا رہا ہے۔

وقت کی یہ ستم ظریفی بھی ملاحظہ کیجئے کہ آج ان ملکوں پر آوازے کسے جا رہے ہیں جو فوجی ساز و سامان کی خرید پر بے پناہ سرمایہ خرچ کر رہے ہیں' اور جو ملک اس تباہ کن فوجی ساز و سامان کو تیار کر رہے ہیں' انہیں کچھ نہیں کہا جاتا۔ ایسے ہی آج وہ ملک تنقید کا نشانہ بن رہے ہیں' جو منشیات کا کاروبار کر رہے ہیں' لیکن جو ملک ان منشیات کا استعمال کر رہے ہیں' ان پر کسی نے انگلی تک نہیں اٹھائی۔

صحیح بات یہ ہے کہ آج عالمی بستی کی آنکھیں بڑی بے تابی سے ہماری طرف دیکھ رہی ہیں' آج ہماری روایات پر عقلیت کا غلبہ ہے۔ جسے معروضیت اور سائنٹیفک نقطہ نظر کا نام دیا گیا ہے۔ اس نقطہ نظر کی جڑیں ہمارے غرور (نفس) کی سرزمین میں پیوست ہیں' یہی غرور (نفس) ہے' جو دکھ' ذاتی مفاد' جماعت کی شکست و ریخت کو قبول کرتا ہے اور بنیادی طور پر معنوی (اخلاقی) اقدار کا انکار کرتا ہے' کیوں کہ سائنس لامحدود کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ غرور نفس' جذبے' محبت' ضمیر اور تجربے کو ہماری زندگی سے خارج کر دیتا ہے۔ اور اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج سائنسی تناظر (Scientistic perspective) میں جس بات کی واقعی اہمیت ہے' وہ ہے حواس کا مشاہدہ۔ رہی یہ بات کہ انسان اپنے باطن میں خدائی وجود کا احساس رکھتا ہے۔ تو آج اس کی موجودہ دنیا سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ جدید انسان نے اپنے رویہ سے یہ بتا دیا ہے کہ "خدا نے فرمایا اور پھر وہ اس دنیا سے الگ ہو گیا"' اس طرح الگ ہونے سے عملی طور پر دنیا کے کاروبار کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا' کیونکہ اس نے اپنے قوانین و نظائر اپنے مقدس صحیفوں میں بیان کر دیئے ہیں یا چند بنیادی اخلاقی قدریں انسان کے پاس ہیں' جن کی موجودگی میں اب دنیا میں خدا کا کردار ختم ہو گیا ہے۔ اگر ہم اس سائنسی نقطہ نظر اور (مذہبی) بنیاد پرستی کا مطالعہ کریں تو دونوں میں کھلی ہوئی مماثلت اور مشابہت نظر آتی ہے' دونوں (سائنسی رویہ اور بنیاد پرستی) کی نگاہیں اس دنیا کے ظاہری اور خارجی پہلو پر ہیں۔ دونوں جگہ انسان اپنے بھائیوں اور کرۂ ارض پر اپنا تسلط چاہتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے برعکس اگر ہم پیغمبروں کی مبارک زندگیوں کو دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کا زور اس بات پر تھا کہ خدائی مملکت (Kingdom of God) تمہارے اندر مضمر ہے۔ اس کائنات کا وجود ایک مقدس تخلیق ہے' یہ ایک بے معنی لھو و لعب کا تماشہ نہیں ہے' (ماخلقت هذا باطلا) چنانچہ تزکیہ نفس' تعصب و تنگ نظری سے رہائی اور روز مرہ کی زندگی کو بامعنی اور مقدس بنانا' اسلام کا پیغام ہے۔ جس میں خود شناسی کی راہ سیدھی خدا شناسی کی منزل تک جاتی ہے۔ (من عرف نفسه عرف ربه) پروفیسر موصوف نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ امریکہ کے لوگ اپنی انفرادیت اور تخلیقی کردار کو عزیز رکھتے ہیں اور زندگی کے فن (of Life

Art) کی قدر کرتے ہیں۔ چونکہ تصوف ان قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس لیے آج امریکہ میں سب سے مقبول شاعر جلال الدین رومی ہیں۔ پندرہ سال پہلے شاید ہی کسی کے وہم و گمان میں یہ بات آئی ہوگی کہ اس عظیم روحانی رہنما کی شاعری کے اس قدر کثرت سے تراجم وجود میں آئیں گے۔ یاد رہے کہ یہاں سان فرانسیسکو (San Francisco) میں تصوف کی ایک عالمی تنظیم ہر سال ایک اجتماع منعقد کرتی ہے جس میں شرکت کے لیے پوری دنیا سے صوفیاء کرام آتے ہیں۔ اب یہاں Sufi Review مجلّہ بھی نکلتا ہے' جو شعر و ادب کی تمام اصناف پر تبصرہ کرتا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ مغرب نے (اپنی تلاش) میں ایک طویل سفر کیا ہے' اس نے علم کلام' روشن خیالی (Enlightment) عقل پسندی اور سائنٹیفک وادیاں طے کی ہیں' لیکن اس سفر میں اسے خدائی ذوق (Divine Taste) سے' جو ایک اسلامی روایت ہے' واسطہ نہیں پڑا۔ صوفیانہ بصیرت نے جس "انسان کامل" کا راز پایا ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں خدا کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر سرنگوں پاتا ہے' اور پوری دنیائے انسانیت کے لیے' نصرانی ہو یا یہودی' انسان دوست (Humanists) ہو یا تاوازم کے ماننے والے یا کوئی اور جماعت غرضیکہ ہر وہ انسان جو آج بھلائی کی تلاش میں ہے' ان سب کے سامنے امت اسلامیہ اپنے اس نقطہ نظر کا شعوری طور پر اقرار کرتی ہے کہ وہ پیغمبرانہ روایت یعنی انسانیت کی تکمیل کے لیے برابر کام کرتی رہے گی۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ اپنے بے پایاں لطف و کرم سے ہمیں اس ذوق تکمیل (Perfection) کی توفیق عطا فرمائے۔ تاکہ ہمارا باہمی طرز عمل اور ہماری سیرتیں صحیح معنی میں خدائی صفات کا عکس بن سکیں۔

ہم نے یہاں پروفیسر موصوف کی لطیف تقریر کی بنیادی باتیں بیان کی

ہیں۔ ان کی تقریر کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ روحانی اقدار کو اپنائے بغیر ہم موجودہ سوسائٹی میں جس نے ارض و سماء کو فساد سے بھر دیا ہے' اپنا کردار ادا نہیں کرسکتے۔ موجودہ بحران اخلاقی اور روحانی بحران ہے۔ اس تقریر کے بعد سوالات کا وقفہ تھا۔ جس میں دوستوں نے حصہ لیا۔ خاکسار نے پروفیسر موصوف سے درخواست کی کہ وہ موجودہ مسلم دنیا کے سیاسی اور اجتماعی نظام سے تغافل نہ برتیں جس کے جور و استبداد نے لوگوں کی فکری اور سیاسی حریت پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اپنے گھر کو درست کئے بغیر ہم "عالمی گاؤں" میں اپنا تاریخی کردار ادا نہیں کرسکتے۔

اس اجلاس کے بعد ایک دوسرا مختصر اجلاس "اسلام میں ریاست" کے موضوع پر ہوا۔ جس میں بھارت کے سکالر علی اصغر انجینئر نے اپنے مقالے کی بنیادی باتیں بیان کیں۔ فاضل مقالہ نگار کا کہنا تھا کہ قرآن مجید نے عدل' احسان' رحمت اور حکمت کے نام سے چار بنیادی قدروں کی تلقین کی ہے۔ افسوس! ایک مختصر سی مدت کے علاوہ یہ قدریں ایک سوشل حقیقت کا روپ نہ دھار سکیں اور تاریخ نے اس تجربے کو کامیاب ہونے نہیں دیا۔ انجینئر صاحب کا کہنا ہے کہ مذہب نے عبادات' اقدار' افکار اور اداروں کا نظام دیا ہے۔ جہاں تک قدروں اور عبادات کا تعلق ہے' انہیں دوام حاصل ہے۔ البتہ نظامہائے فکر اور ادارے' وقت کے ساتھ ساتھ قابل تغیر اور ارتقاء پذیر واقع ہوئے ہیں۔

ہرچند کانفرنس کے مختلف اجتماعات کے لیے مختلف موضوع مقرر تھے اور ان پر بحث کے لیے عربی' اردو اور انگریزی گروپ بنائے گئے تھے۔ لیکن گروپ مقررہ پروگرام کے مطابق اپنے اجلاس منعقد نہ کرسکے' بلکہ صرف دو ایک موضوعات پر بحث کرنے کے لیے سارے گروپ اکٹھے ہوگئے اور جس سے طے شدہ پروگرام پر عمل نہ ہوسکا۔

8 ستمبر کی شام کو کانفرنس کا ایک آخری اجلاس ہوا' جس میں ابن خلدون سوسائٹی کے انتظامی امور پر بات چیت ہوئی اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد خالد مسعود نے ابن خلدون سوسائٹی کے مقاصد کو عملی شکل دینے کے لیے چند ٹھوس تجویزیں پیش کیں' مثلاً

1- سوسائٹی کا ایک تحقیقی مجلّہ ہونا چاہیے جو لوگوں اور سوسائٹی سے منسلک حضرات کے لیے اظہار خیال کا ایک پلیٹ فارم مہیا کرے۔

2- موجودہ وقت میں اسلامی موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ یا تو فرسودہ روایتی انداز لیے ہوئے ہے' یا پھر وہ بنیاد پرستوں کے ابہام کا شکار ہے۔ چنانچہ آج بازار میں ایسی کتابیں دست یاب نہیں ہیں' جن میں صحت مند ترقی پسند اور متوازن نقطہ نظر کا سراغ ملتا ہو۔ چنانچہ ابن خلدون سوسائٹی سے وابستہ حضرات کا فرض ہے کہ وہ ایک مربوط پروگرام کے تحت تاریخ' فلسفہ اور دوسرے موضوعات پر پائے جانے والے مواد کو لے کر اقتصادیات' ادب' پولیٹیکل سائنس اور دوسرے موضوعات پر کتابیں لکھیں جو اساتذہ' نصابی کتابیں لکھنے والوں اور تحقیق و ریسرچ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ماخذ اور حوالے کا کام دے۔

3- موجودہ وقت میں بین الاقوامی وسائل ابلاغ اسلام کے ایک ہی رخ کو پیش کر رہے ہیں' حالیہ وقت میں میڈیا' متحرک اور فعال بنیاد پرستوں اور انتہا پسندوں کے ذریعے پرکشش بننا چاہتا ہے۔ بنیاد پرست چند سیاسی مقاصد کی تبلیغ کرتے ہیں' اس لیے ایک آزاد ٹیلیویژن چینل کی ضرورت ہے۔ جو آزاد بحث و مذاکرہ کی حوصلہ افزائی کرے' اور کسی خاص نظریہ یا حکومت کی حمایت نہ کرے۔ یہ پروگرام چند خاص تقریروں تک محدود نہ رہیں' بلکہ مسلمانوں کے طریقہ ہائے حیات کی بوقلمی اور مسلم ثقافت کی رنگارنگی کو بھی دنیا کے سامنے پیش کرے۔

ڈاکٹر ایم۔ خالد کی تجویزوں سے آج شاید ہی کسی کو اختلاف ہو' اس لیے نہ صرف ابن خلدون سوسائٹی بلکہ مسلم دنیا کے اہل فکر کو کانفرنس میں زیر بحث آنے والے مسائل پر سنجیدگی سے لکھنا چاہیے' تاکہ ہمارے نوجوان اپنے بنیادی مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو کر اور وقت کے پہلو بہ پہلو چل کر "عالمی بستی" میں اپنا کردار ادا کریں۔ حالیہ وقت میں ان مسائل پر "بنیاد پرستی" کے قلم سے جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ ژولیدہ فکری اور ابہام کا شکار ہے۔ ادھر کئی سال پہلے واشنگٹن سے نکلنے والے مجلّے "Middle East" میں ایک ترکی اسکالر نے "اسلامی معاشیات" پر شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ فنی نقطہ نظر سے ان تحریروں میں کوئی وزن نہیں ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی قسم کا ایک بیان پاکستان کے ایک سابق وزیر خزانہ جناب غلام اسحاق خان نے جو بعد میں ملک کے صدر بھی رہے۔ دیا تھا کہ موجودہ بنکوں کے نظام کو "مسلم نظام معیشت مضاربت" سے بدلنا دراصل سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ پر سرمایہ دارانہ نظام کو لانا ہے۔ آپ نے اس امر پر بھی افسوس کا اظہار کیا تھا کہ مسلم ماہرین معیشت نے سنجیدگی سے اسلام کے نظام اقتصاد پر جو قرآنی اقدار: عدل و احسان پر مبنی ہے' کوئی کام نہیں کیا۔ اقتصاد کا یہ اخلاقی نظام صرف خطابت کے زور سے وجود میں نہیں آئے گا۔ یہ تقریریں سیاسی مقاصد کے لیے تو شاید مفید ہوں' لیکن ان سے حقائق نہیں بدلتے۔" (ملاحظہ ہو ڈان' 18 مارچ 1984ء)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ 1984ء ہی میں خاکسار نے ڈاکٹر فضل الرحمان سے کہا تھا کہ وہ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسلام میں ریاست" کے موضوع پر لکھیں۔ اس لیے کہ آج کا نوجوان اخلاص کے ساتھ سچائی کی تلاش میں ہے۔ خاکسار نے یہ مشورہ ان کی کتاب "قرآن کے بنیادی تصورات" پڑھ کر دیا تھا۔ القصہ ہمیں توقع ہے کہ ابن خلدون سوسائٹی وقت کا

یہ اہم فریضہ سرانجام دے سکتی ہے' کیوں کہ اس کے پیچھے کام کرنے والی ایک متحرک اور جاندار شخصیت جہاں عربی اور اردو زبانوں سے پوری طرح آگاہ ہے' وہاں وہ انگریزی' فرانسیسی' جرمن اور سپینش زبانوں سے بھی آگاہ ہے۔ اس شخصیت سے میری مراد ڈاکٹر خالد دوران سے ہے' جو آج کل واشنگٹن کے ایک سہ ماہی مجلّہ Trans State Islam کے ایڈیٹر ہیں' اور تحقیق و ریسرچ کا ایک وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ کئی سال پاکستان میں رہ چکے ہیں اور متعدد موضوعات پر خاص طور پر ڈاکٹر احمد امین پر علامہ اقبال کے فکری اثرات' ان کا قلم جوہر بھی دکھا چکا ہے۔ ان سے توقع ہے کہ وہ ابن خلدون سوسائٹی کو ایک فکری تنظیم کی حیثیت سے متعارف کرانے میں کامیاب رہیں گے اور اسے سیاست یا فرقہ واریت کے وقتی ہنگاموں اور پروپیگنڈے سے دور رکھیں گے۔ ابن خلدون سوسائٹی' جس کا صدر دفتر وہ تیونس میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر صحیح معنی میں ایک فکری ادارہ بن گئی' تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہو گا۔

9/ ستمبر کی صبح کو ڈاکٹر خالد اور خاکسار لندن یونیورسٹی میں ادارہ شرقیات (S.O.A.S) کی معروف لائبریری میں گئے' جو حال ہی میں یونیسکو کے تعاون سے صحیح معنوں میں "بیت الحکمت" کا نمونہ بن گئی ہے اور ریسرچ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بہترین جگہ ہے۔ ڈاکٹر خالد 10 ستمبر کو واپس اسلام آباد آ گئے' لیکن خاکسار 20/ ستمبر تک وہیں رہا' اور ہند و پاک کے پرانے ساتھیوں سے ملا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ملاقاتیں بہ قول ذوق "ملاقات مسیحا و خضر" سے بہتر تھیں۔ خاکسار کا قیام ڈاکٹر خالد حسن قادری کے ساتھ رہا۔ ڈاکٹر موصوف سے پرانی نیاز مندی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان چند آدمیوں میں سے ہیں' جنہیں خدا نے علم' عقل اور عشق سے نوازا ہے۔ انہوں نے مولانا حسرت موہانی پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا ہے' جو دہلی میں شائع ہوا ہے۔ ایسے ہی ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ان کے قلم سے حمید الدین خان کی

کتاب "احکام عالم گیری" کا اردو ترجمہ پہلی بار شائع کیا ہے جسے برصغیر کے علمی حلقوں نے پسند کیا۔ ادھر کئی سال پہلے ہم نے ان کی ایک دوسری کتاب "تلاش حق" بھی شائع کی تھی۔ اور عن قریب ان کے قلم سے تصوف کے معروف رسالہ القشیریہ کے شارح زکریا انصاری کے ایک مختصر رسالے کا اردو ترجمہ بھی پریس میں جا رہا ہے۔ ڈاکٹر موصوف اردو ادب کی معروف شخصیت مولانا حامد حسن قادری کے صاحبزادے ہیں۔ ڈاکٹر قادری کے علاوہ ہمارے ایک قدیم دوست ڈاکٹر افتخار احمد سید سے نیاز حاصل ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سلسلہ ہائے شب و روز کی گردش سید صاحب کے جذبہ ہائے اخلاص و محبت پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ انہوں نے کئی سال پہلے مجھے غزالی اور اسلامی تصوف پر منٹگمری واٹ اور نکلسن کی کتابوں سے نوازا تھا۔ 1971ء میں لاہور میں مجھے پتہ چلا کہ میرے نانا ان کے خاندان سے بیعت تھے جب انہیں اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے خاکسار کو اپنے لطف و کرم سے مزید نوازا۔ سید صاحب کے علاوہ ڈاکٹر وی' ایس آنند' معین الدین شاہ' جو یہاں لانبے شاہ صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں' سلیم قریشی اور ڈاکٹر عبدالرووف مرزا سے بھی ملنا ہوا' ڈاکٹر انند نے ایک اتوار کو لندن میں ایک جدید جاپانی پلازا کی سیر کرائی اور پر تکلف کھانا کھلایا۔ اپنی کتابوں سے نوازا۔ انہوں نے ابوالکلام آزاد پر انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے۔ جو دراصل دہلی میں ابوالکلام کی برسی پر دیئے گئے ایک لیکچر کا مجموعہ ہے۔ دہلی میں وہ مولانا کی بھانجی ڈاکٹر نجمہ ہبتہ اللہ سے۔ جو آج کل بھارت کے ایوان بالا کی ڈپٹی لیڈر ہیں' ملے' اور مولانا کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل کیں۔ وہ مولانا کی قبر پر "فاتحہ خوانی" کے لیے بھی گئے۔ انند صاحب مذہب کو ایک "آفاقی خدا سرشاری" نظریہ مانتے ہیں اور ہندو مسلم' عیسائی اور یہودی تصوف کو اسی چمن کے گلہائے رنگارنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک دن وہ مجھے ڈاکٹر خالد حسن قادری کے گھر پر چھوڑنے آئے۔

تو ڈاکٹر صاحب کے لیے مٹھائی کا تحفہ بھی ساتھ لائے۔ ڈاکٹر قادری نے کہا یہ کیا تکلف ہے؟ حضرت! کسی درگاہ پر جائیں تو نذرانہ پیش کرنا ہماری روایت ہے۔ انند صاحب نے قادری صاحب کے گھٹنوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ انند صاحب گزشتہ سال ہاؤس آف لارڈز کا ممبر بنتے بنتے رہ گئے۔ ان سے پتہ چلا کہ حالیہ وقت میں برطانیہ میں مقیم ہندوستانی نژاد باشندوں کے چھ آدمی برطانوی پارلیمنٹ یا ہاؤس آف لارڈ کے ممبر ہیں۔ لیکن پاکستانی نژاد باشندوں کا ایک بھی ممبر نہیں ہے۔ لانبے شاہ صاحب کا آگرہ کے سید خاندان سے تعلق ہے' وہ لندن میں ایک اردو ادبی مجلّے کے مدیر ہیں۔ انہیں کئی بار اٹلی اور دوسرے مقامات سے اردو کی تدریس کے لیے لیکچرر شپ کی پیش کش ہوئی لیکن انہوں نے لندن کی گلیوں کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ ایک زمانہ پہلے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے بارے میں انہوں نے جو معلومات اکٹھی کی تھیں وہ ان کی ایک طویل اور صبر آزما محنت کا نتیجہ تھیں۔ یہی گہری تحقیق تھی' جس نے فورٹ ولیم کالج سے متعلق پروفیسر عبارت بریلوی کی تحریروں پر کڑی تنقید کی تھی۔

ہرچند برطانوی شہنشاہیت کا سورج ڈوب چکا ہے' اس کی اجتماعی زندگی کی آب و تاب ماند پڑ گئی ہے اور علمی اداروں میں وہ پہلی سی رونق نہیں رہی' لیکن قومی ادارے برابر کام کر رہے ہیں اور اپنے قومی وقار کا احساس رکھتے ہیں۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری یا برٹش لائبریری اب بھی سکون قلب کے ساتھ کام کر رہی ہیں' خاکسار روز ریل کا پاس لے کر جو ساڑھے تین بجے پاؤنڈ یومیہ ہے' انڈیا آفس جاتا۔ اور اگر کسی "کتاب یا دستاویز کی ضرورت ہوتی تو لائبریری کے ایک ممبر سلیم قریشی مددگار ثابت ہوتے۔ قریشی صاحب انڈیا آفس لائبریری میں برصغیر کی سیاسی تاریخ سے متعلق داستاویزات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ پاکستان کی پچاس سالہ جوبلی پر اگر ہمارے قومی ادارے مثلاً قائداعظمؒ اکیڈمی' کراچی' قومی کمیشن برائے تاریخ و ثقافت' اسلام آباد' تحریک

پاکستان پر کوئی مستند کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو انہیں انڈیا آفس لائبریری سے رجوع کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس سلسلے میں سلیم قریشی اہل علم کی بڑی مدد کرسکتے ہیں۔

قریشی صاحب سے تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی' ایک ملاقات میں انہوں نے پروفیسر زیدی کی نگرانی میں شائع ہونے والے قائداعظمؒ پیپرز کے بارے میں کہا کہ موجودہ دو شائع شدہ جلدوں کا 75 فیصد مواد "انتقال اقتدار" نامی معروف کتاب (Transfer of Power) سے لیا گیا ہے۔ اصل مواد شاید 15 فیصد سے زیادہ نہیں۔ قریشی صاحب کی اپنی ایک کتاب "قائداعظمؒ" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس چھاپ رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی سکالرز نے جو سرکاری خرچ پر لندن یاترا کے لیے آتے ہیں' انڈیا آفس لائبریری سے صحیح معنی میں استفادہ نہیں کیا۔

لندن میں آج کل ایک بحث برطانوی تخت کے وارث شہزادہ چارلس کے مذہبی عقائد کے بارے میں چل رہی ہے۔ برطانوی شہزادے نے کہا ہے کہ وہ دستوری طور پر ایمان (Faith) کے محافظ ہیں۔ ایمان کی کسی خاص شاخ کے نہیں' اس پر ایک پادری نے کہا ہے کہ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سارے مذاہب کے محافظ ہیں' تو یہ بات درست ہے لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ سارے مذہب برابر ہیں' اور عیسائیت کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فضیلت نہیں' تو چرچ اسے تسلیم نہیں کرتا' اس لیے اس نے مطالبہ کیا کہ شہزادہ کے عقائد میں جو ابہام اور شبہات پائے جاتے ہیں' شہزادہ کو انہیں دور کرنا چاہیے۔ (گارڈین' 11 ستمبر 1996ء ص 5)

دیکھیے کہ برطانیہ کی قومی قیادت کسی بصیرت سے وقت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سنڈے ٹائمز نے اسی "بصیرت" کی ایک دوسری کہانی لکھی ہے کہ پوپ جون پال (John Paul II) نے CIA اور امریکی حکومت سے مل کر

مشرقی یورپ میں کمیونزم کو شکست دینے میں "تاریخی" کردار ادا کیا ہے۔ جون 1979ء میں پوپ کا دورہ پولینڈ اسی "مقدس تعاون" کی کڑی تھا۔ جس پر امریکہ کے صدر ریگن کا کہنا تھا کہ وہ اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ یہاں دو بڑی طاقتوں کے علاوہ ایک تیسری بڑی طاقت ویٹی کان بھی ہے۔ اس "تاریخی اتحاد" کا انکشاف کارل برنسٹین (Carl Bernstein) نے پوپ کی سوانح حیات میں کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یورپ نے بظاہر کس خوب صورتی سے ریاست اور کلیسا کے دائرۂ کار کو سیکولرزم اور مذہب کے نام سے الگ الگ متعین کیا ہے' لیکن کمیونزم کو مشرقی یورپ اور پھر سویت یونین میں مکمل شکست دینے کے لیے چرچ اور سٹیٹ نے مل کر کام کیا ہے۔ اس انکشاف کو پڑھتے وقت اقبال بے اختیار یاد آئے' فرماتے ہیں:

دیکھ مسجد میں شکست رشتہ تسبیح شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سنڈے ٹائمز 15 ستمبر 1996ء)

لندن سے باہر رہنے والے چند دوستوں (مجاہد جہلمی اور جاوید صاحب) نے بریڈ فورڈ آنے کی دعوت دی' جہاں ان کے پاس تصوف پر کلاسیکی کتابوں کا نادر ذخیرہ ہے' شوق کے باوجود وہاں نہ جاسکا۔ جب واپس لاہور آیا تو انہوں نے معروف عارف باللہ روز بہان بقلی کی کتاب "رسالتہ القدس و رسالہ غلطات الساکلین" کی عکسی تصویر بھجوائی۔

افسوس! لندن کانفرنس کی داستان طویل ہوگئی' لیکن میری بات ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست